AL-QALAM القلم
ISSN 2071-8683 E-ISSN 2707-0077
Volume 25, Issue, 1, 2020
Published by Institute of Islamic Studies,
University of the Punjab, Lahore, Pakistan.

داخلی امن واستحکام سے متعلق قرآنی مبادیات: ایجابی و سلبی پہلو

Quranic Principles regarding internal peace and strength: Positive and Negative Aspect

***Ghulam Rasool Zahid**
**** Dr. Abdul Hameed Abbasi**
* PhD Scholar, Allama Iqbal Open University, Islamabad
**Chairman, Department of Quran and Tafsir, Allama Iqbal Open University, Islamabad

Abstract

Peace and security are the essential pre-requisites of a civilized human society, and thus fundamentally prime responsibility of a state to ensure its maintenance and consolidation. The Holy Quran, emphasizes the significance of peace and security, both internal and external, and provides perfect guidance laying down basic principles and guidelines encompassing diversified aspects of peace to bring about and maintain security and tranquility in the society under the elaborate state structure based on policy measures. These guiding principles of Quran, whenever put into practice, have yielded immensely beneficial outcome in terms of policy formulation and strategic implementation. Internal peace and security of a state can only be guaranteed if all the ingredients of social, economic, political and criminal justice, as ordained by Allah, are put in place. The positive measures prescribed by Holy Quran include character building of the citizens on the lines prescribed by Quran, economic welfare and social betterment of the masses besides social integration, political enlightenment and supremacy of law. Eradication of economic depravity and social inequalities, curbing criminal and anti-social elements, waging effective war against internal and external hostile forces and coming down on all forms of injustice with iron hands are the negative measures to achieve the goal of a peaceful and secure society in the light of Quran.

امن وامان کرۂ ارض میں بسنے والے انسانوں کی بنیادی ضرورت ہے۔مادی وروحانی ترقی کا ہر وہ راستہ جو انسانوں کی فلاح و اصلاح سے وابستہ ہے، اس کی تمام تر جزئیات جن میں ذہنی آسودگی، باہمی یگانگت، مساواتِ انسانی، معاشرتی اعتدال اور عالمگیر نظامِ انصاف براہِ راست امن واستحکام سے جڑی ہوئی ہیں، جبکہ اس کا دائرہ کار رنگ و نسل، اعتقادات، فکر و منہج، قدیم وجدید نظریات، سلک و سلسلے اور مذہب و ثقافت سے ماوراء ہے، گویا سلامتی انسانیت کے مساکن اور معبد خانوں کو محفوظ بنانے کی اساس ہے، جس سے تمکن فی الارض، نظریہ اور نظام کو باوقار حیثیت

ملتی ہے۔استحقاقات کا حصول اور فرائض کی انجام دہی بھی اس وقت تک ادھوری رہے گی جب تک معاشرتی استحکام کی راہ ہموار نہ کی جائے۔ عدم استحکام،انتشار، افراتفری، بدامنی اور اضطراب کی کیفیت کبھی بھی صحت مند معاشروں کے ضامن نہیں رہے ہیں، لہٰذاانسانی جان ومال سے جڑے ہوئے اس اہم مسئلے کا ضروری تقاضا ہے کہ امن و استحکام سے متعلق قرآنی مبادیات سے عموم و خصوص کو روشناس کروایا جائے اور امن کی عملداری (Execution) کو یقینی بنایا جائے۔اس سلسلے میں قرآن مجید مؤثرانداز سے ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

روئے زمین پر انسانیت کی ہدایت اور برکت کے لیے تعمیر کیے جانے والے پہلے گھر کا ایک مقصد امن وسلامتی کا پیغام لوگوں تک پہنچانا تھا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾[1]

"بیشک سب سے پہلا وہ گھر "جو لوگوں کیلئے مقرر کیا گیا" وہی ہے جو مکہ میں ہے، وہ بابرکت اور اہلِ عالم کیلئے مرکزِ ہدایت ہے"۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾[2]

"اور جو اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا ہو جاتا ہے"۔

گویاہدایت ورہنمائی کی راہ بھی ہموار کرنے کے لیےامن وسلامتی کا کلیدی کردار ہے۔لوگوں کو ایک ہی مقام پر مجتمع کرنا ایک طرف مذہبی تفریق کے خاتمے کا باعث ہے تو دوسری طرف وحدتِ امت کا فلسفہ بھی اس سے اجاگر ہوتا ہے۔رسولِ اکرم پیغمبر امن ﷺ سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا،اے اللہ کے رسول ﷺ!

﴿ أَيُّ مَسْجِدٍ وُضِعَ فِي الأَرْضِ أَوَّلُ؟ قَالَ: الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ﴾[3]

"زمین میں کون سی مسجد سب سے پہلے بنائی گئی تھی؟آپ ﷺ نے فرمایا: مسجد حرام"۔

اسی گھر سے جڑی ہوئی امن وسلامتی کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَوَ لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا﴾[4] کیاہم نے انہیں امن وامان اور حرمت والے حرم میں جگہ نہیں دی؟۔

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾[5]

"کیااُنہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے حرم کو امن کی جگہ بنایا ہے؟اور اُن کے آس پاس سے لوگوں کو اغواء کر لیا جاتا ہے"۔

بیت اللہ میں امن وامان کی صورتحال دو مد نظر رکھتے ہوئے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

i. بیت اللہ کا وجود جہاں باعث رحمت و برکت ہے، وہیں اس کا وجود امن وامان کی بھی ضمانت فراہم کرتا ہے اور ساتھ ہی اس تاثر کو مزید تقویت ملتی ہے کہ انسانیت کا آرام وسکون اور راحت وآسودگی امن وامان میں مضمر ہے

ii. پہلے گھر کو امن وامان والا بنانے کا مقصد ایک ایسا رول ماڈل لوگوں کے سامنے پیش کرنا تھا، جس کی طرز پر معبد خانے، معاشرے اور ریاستوں کی تشکیل و ترتیب ہو، جس سے مساجد اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہیں استحکام کی ایسی نظیر پیش کریں، جو ریاست کے دیگر داخلی معاملات میں مدومعاون ثابت ہوں۔

داخلی امن واستحکام کا ایجابی پہلو:

انسانی آبادکاری اور تمدن وحضارت کی کسی بھی شکل میں امن ضروری امر ہے، اس کا دخل انفرادی سطح سے لے کر اجتماعی، ملکی اور ریاستی سطح تک ہونا ایک کامیاب اور پر سکون معاشرے کے لیے رفاہیت و بہبودی کے لیے ضروری ہے۔ تمام انبیاء f اور امت محمدیہ کے لیے بیت اللہ کو عبادت اور مجتمع ہونے کے لحاظ سے مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے، لیکن لوگوں کے اجتماع کے لیے اس جگہ کو فتنہ وشر انگیزی سے دور رکھتے ہوئے امن کا گہوارہ بنانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اسی طرز کے مطابق ریاستوں کی تشکیل نو اور انسانی آبادی کاری کا نظام عمل میں لایا جائے، قرآن مجید میں ارشادِ باری ہے:

﴿وَ اِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَ اَمۡنًا﴾[6]

"اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے جمع ہونے اور امن کی جگہ کے طور پر مقرر کیا"۔

مجتمع انسانی کسی بھی شکل میں ہو، اس کے لیے امن واستحکام کو ملحوظ رکھنا منشاء خداوندی ہے، جس کا بنیادی مقصد احکاماتِ خداوندی کی تعمیل کے ساتھ ساتھ انسانی شرف کو بھی قائم رکھنا ہے۔

ایک عمدہ معاشرے کے لیے یہ بنیادی چیزیں ہیں کہ اس معاشرہ میں قتل وغارت گری نہ ہو، وہاں کے باشندوں کو ظلم وجبر، دھاندلی دھونس اور استبداد سے محفوظ رکھنے کے لیے ہر طرح کے اقدامات کیے جائیں، جس سے وہاں کے لوگوں کے جان ومال اور عزت وآبرو محفوظ رہ سکے۔

روحانی وجسمانی بالیدگی اور تعمیر وترقی کے لیے خوف وہراس، دہشت وقنوطیت زہر قاتل سمجھے جاتے ہیں، یعنی ایسے شنیع اور مذموم عناصر کی موجودگی میں معاشروں کی عمرانی، صحی، ادبی اور تمدنی روایات کا تحفظ خطرے سے دوچار ہو جاتا ہے، چنانچہ انبیاء کرام علیہم السلام کی دعائوں کو اگر بنظر غائر دیکھا جائے، خصوصاً سیدنا ابراہیم ؑ جب انہیں

بیت اللہ کی آبادکاری کا فریضہ سونپا گیا، تو ان کے پیش نظر اس امن وامان کی کیا اہمیت اور قدر تھی، قرآن مجید میں ان کی دعا سے ہمیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے، ارشاد ہے :

﴿وَ اِذ قَالَ اِبرٰھمُ رَبِّ اجعَل ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾[7]

"اور جب ابراہیم نے کہا کہ پروردگار! اس شہر کو امن والا بنادے"۔

علامہ ابو بکر الجصاص آیت مذکور کی تفسیر میں حدود حرم میں امن و امان کو ہر صورت قائم رکھنے کے ضمن میں رقمطراز ہیں:

"یہ آیت اس امر پر دال ہے کہ بیت اللہ کو امن کی صفت کے ساتھ موصوف کرنا پورے حرم کا مقتضی ہے، اس لیے کہ حرم کی حرمت کا تعلق جب بیت اللہ کے ساتھ ہے تو یہ بات جائز ہے کہ بیت کے اسم کے ذریعے پورے حرم کی تعبیر کی جائے اس لیے کہ حدود حرم میں امن حاصل ہوتا ہے اور اس میں قتل و قتال کی ممانعت ہے، اسی طرح اشہر حرم کی حرمت کا تعلق بھی بیت اللہ کے ساتھ ہے کیونکہ ان مہینوں میں لوگوں کو امن حاصل ہونا حج کی وجہ سے ہے اور حج کا مرکز بیت اللہ ہے۔ قول باری: ﴿وَ اِذ جَعَلنَا البَیتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَ اَمنًا﴾ اللہ کی طرف سے حکم ہے، خبر نہیں ہے، اسی طرح قولِ باری: ﴿رَبِّ اجعَل ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ اور قول باری: ﴿وَ مَن دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا﴾ حکم کے طور پر ہے۔ یہ قولِ باری اس بات کی خبر نہیں ہے کہ جو شخص بیت اللہ میں داخل ہو جائے گا اسے کوئی تکلیف لاحق نہیں ہو گی، اس لیے کہ اگر یہ خبر کی صورت میں ہوتا تو خارجی اعتبار سے صورتِ حال وہی ہوتی جس کی خبر دی گئی ہے، کیونکہ اللہ کی دی ہوئی خبروں کے لیے ضروری ہے کہ خارجی اعتبار سے بھی صورت حال اسی طرح ہو جس کی خبر دی گئی ہے۔ ﴿وَلَا تُقٰتِلُوھُم عِندَ المَسجِدِ الحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوکُم فِیہِ فَاِن قٰتَلُوکُم فَاقتُلُوھُم﴾ اور تم اُن سے مسجدِ حرام کے قریب قتال نہ کرو، یہاں تک کہ وہی تم سے اس میں قتال کریں، سو اگر وہ قتال کریں تو تم بھی اُنہیں قتل کرو"۔ اس آیت کے ذریعے اللہ نے مسجد حرام کے پاس قتل کے وقوع کی خبر دی۔ یہ بات اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آیت میں مذکورہ امر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرم میں امن قائم رکھنے کے حکم کے قبیل سے ہے، نیز یہ کہ وہاں پناہ لینے والے کو قتل نہ کیا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے لے کر آج تک حرم کا یہی حکم ہے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی عرب کے لوگ حرم کے سلسلے میں اسی بات کا اعتقاد رکھتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کی بچی کھچی صورت کے تحت حرم کے اندر قتل کا ارتکاب کرنا عظیم گناہ سمجھتے تھے"۔[8]

امن و امان کی ضرورت داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے، لیکن داخلی اعتبار سے اس کا دائرہ جسمانی اور روحانی دونوں کو محیط ہے۔ جسمانی لحاظ سے اس لیے ضروری ہے کہ اس سے انسانی جان کو محفوظ بنایا جاتا ہے، جبکہ روحانی اعتبار سے اس لیے ضروری ہے کہ اس سے تعلق باللہ اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ خوف کی کیفیت میں ایسی صورت حال کا پیدا ہونا محال ہے۔ امن کے ایجابی پہلو کو سمجھاتے ہوئے اسے ذکر اللہ اور شعائر اللہ دونوں سے جوڑا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنۡ خِفۡتُمۡ فَرِجَالًا أَوۡ رُكۡبَانًا فَإِذَآ أَمِنتُمۡ فَاذۡكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمۡ تَكُونُوا تَعۡلَمُونَ﴾[9]

"پھر اگر تمہیں خوف لاحق ہو تو پاپیادہ ہو کر پڑھو یا سوار ہو کر، پھر جب تم پُر امن ہو جاؤ تو اللہ کو اُسی طرح یاد کیا کرو جیسے اُس نے تمہیں وہ باتیں سکھائی ہیں جو تم نہیں جانتے تھے"۔

یعنی دشمن سے خوف کے وقت جس طرح بھی ممکن ہے، پیادہ چلتے ہوئے، سواری پر بیٹھے ہوئے نماز پڑھ لو، لیکن جب خوف کی حالت رفع ہو جائے تو پھر اسی طرح نماز پڑھو جس طرح سکھلایا گیا ہے۔

مذکورہ بالا آیت حالت امن میں ملنے والی آسودگی پر دال ہے کہ جس کا حالتِ خوف اور اضطراری کیفیت میں ملنا ممکن نہیں، لہٰذا امن و استحکام جہاں جانی تحفظ کے حوالے سے مستحسن عمل ہے وہاں روحانی بڑھوتری اور شعائر اللہ سے تمسک کی بھی بہت بڑی دلیل ہے۔

محمد حسین ہیکل اپنی کتاب "حیات محمد ﷺ" میں داخلی امن و استحکام کی افادیت و اہمیت سے متعلق درج ذیل امور کی نشاندہی کرتے ہیں:

" داخلی استحکام و وحدت کے حوالے سے میثاق مدینہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں ایک مملکت قائم ہوئی، مملکت استحکام کی ضمانت ہوتی ہے۔ مدینہ کی مملکت میں قانون کی حاکمیت قائم کی گئی۔ مملکت کے اندر بسنے والے تمام طبقات و مذاہب کے لوگوں کو اعتماد میں لے کر انہیں احساس دلایا گیا کہ تمام مذاہب کے لوگ مساوی طور پر مملکت کے دفاع کے ذمہ دار ہوں گے۔ قتل و غارت لاقانونیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لاقانونیت امن و سکون کی دشمن ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے انسداد کے لیے میثاقِ مدینہ میں دیت کے قانون کی بھی وضاحت فرمادی اور اس بات کا تعین کر دیا کہ کسی مقتول کا بدلہ لینے کا کیا اصول نافذ ہوگا۔ خون بہا، دیت اور فدیہ کا جو طریقہ عہد جاہلیت میں رائج تھا اسے برقرار رکھا گیا"۔[10]

قرآن مجید میں مستحکم امن کی کاوشیں کرنے والے دو گروہوں کا تذکرہ ہے، ایک انبیائے علیہم السلام کا گروہ جو انسانی وحدت کے قیام کے لیے ہر ممکن اصلاح و فلاح کے لیے سر گرم عمل رہتے ہیں، پھر ان کے پیروؤں کا وہ مصلح گروہ جو اپنی کاوشوں سے انبیاء علیہم السلام کے رائج کردہ امن کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں، فتنہ، شر انگیزی اور تخریب کاری کے ہر طریقے کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کا انسداد کرتے ہیں، یہ گروہ قرآن کریم کے مطابق ہدایت یافتہ ہے، لیکن ایک ایسا گروہ جو نام نہاد اور مصنوعی کاوشوں کا سہارا لیتے ہیں، کلام حمید میں ان کی دورُخی اور دغابازی کو بھی عیاں کیا گیا ہے، تاکہ استحکام کی مثبت اور منفی کوششوں کی صحیح معنوں میں پہچان ہو سکے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿سَتَجِدُونَ ءَاخَرِينَ يُرِيدُونَ أَن يَأۡمَنُوكُمۡ وَيَأۡمَنُواْ قَوۡمَهُمۡ كُلَّمَا رُدُّوٓاْ إِلَى ٱلۡفِتۡنَةِ أُرۡكِسُواْ فِيهَاۚ﴾[11]

عنقریب تم ایک اور قوم کو بھی پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں، جب بھی انہیں فتنے کی طرف لوٹایا جاتا ہے تو وہ اس میں الٹے ہو جاتے ہیں۔

دراصل امت کی وحدت اور شیرازہ بندی کے حصے بخرے کرنے والا یہی وہ گروہ ہے جو اپنی دورُخی کے باوصف اپنی نیت کو ٹھیک طریقے سے واضح نہیں کرتا، تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کو اتنا نقصان اپنے دشمنوں سے نہیں پہنچا، جتنا اُن لوگوں سے پہنچا جو صفوں میں گھس کر دھوکا دہی سے کام لیتے اور اپنے مکر و فریب والی چال چلتے ہوئے مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں ایسے لوگوں کی نشاندہی کرتے ہوئے درج ہے:

یہ لوگ ظاہری صورت میں تو ان لوگوں ہی کی طرح ہے کہ یہ نیت کے اعتبار سے ان سے مختلف ہیں، کیونکہ یہ منافق ہیں، نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے تو اسلام کا اظہار کرتے تاکہ اپنے خونوں، مالوں اور اولادوں کو بچا سکیں مگر خفیہ طور پر یہ کفار سے دوستی رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر وہی عبادت کرتے ہیں جو وہ عبادت کرتے ہیں تاکہ ان کے پاس مامون ہو جائیں اور خفیہ طور پر بھی یہ انہی کے ساتھ ہیں''۔[12]

اسی طرح قرآن مجید میں اس گروہ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے جو اوہام باطلہ سے دور رہنے والا اور ہواءِ نفس سے بچتا ہوا خالص وحدانیت کا قائل ہے، دنیا کے قائم کردہ نظاموں کے مقابلے میں وہ وحی الٰہی کا پیرو ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَيۡفَ أَخَافُ مَآ أَشۡرَكۡتُمۡ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمۡ أَشۡرَكۡتُم بِٱللَّهِ مَا لَمۡ يُنَزِّلۡ بِهِۦ عَلَيۡكُمۡ سُلۡطَٰنًاۚ فَأَيُّ ٱلۡفَرِيقَيۡنِ أَحَقُّ بِٱلۡأَمۡنِۖ إِن كُنتُمۡ تَعۡلَمُونَ﴾[13]

"میں اُن سے کیوں ڈروں جنہیں تم نے اللہ کے ساتھ شریک بنار کھا ہے، جبکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک بنار کھا ہے جس کی اُس نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری، تو دونوں میں سے کون سافریق امن کا زیادہ حقدار ہے؟ اگر تم جانتے ہو"۔

امن اور نجات کے فروغ کے لیے کون مخلص ہے اور کون بد خواہ، قرآن مجید کی آیت مذکورہ دونوں گروہوں کی واضح طور پر ترجمانی کر رہی ہے، یقیناحق اور سند کے مقابلے میں ظن و گمان کی کوئی حیثیت نہیں، اسی طرح ایسا گروہ جو من مانی تاویلات کے ذریعے لوگوں پر اپنی باطل سوچ مسلط کرتا ہے، از روئے قرآن ایسے گروہ کو بھی فتنہ وفساد پھیلانے والا گروہ تصور کیا گیا ہے۔

حافظ ابن کثیر درج بالا آیت سے متعلق امن وامان کو قائم رکھنے کی حکمت سے متعلق لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا ہے: ﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ "اور اگر کوئی ایک مشرکوں میں سے"، ان میں سے جن سے قتال کا میں نے آپ کو حکم دیا ہے اور جن کی جانوں اور مالوں کو آپ کے لیے مباح قرار دیا ہے: ﴿اسْتَجَارَكَ﴾ "آپ سے پناہ کا خواست گار ہو"، یعنی آپ سے امن طلب کرے تو اس کی درخواست کو قبول کر لیجئے حتیٰ کہ وہ اللہ کے کلام قرآن مجید کو سن لے جسے آپ اسے پڑھ کر سنائیں اور دین کی کچھ باتوں کا اس کے سامنے ذکر کریں تاکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو جائے: ﴿ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ﴾ "پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہنچادیجئے"۔ یعنی وہ امن میں ہو اور اسے امان حاصل ہو، حتیٰ کہ وہ اپنے ملک، اپنے گھر اور اپنے امن کی جگہ پہنچ جائے۔ ابن ابو نجیح نے امام مجاہد سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے یہ فرمایا ہے کہ اگر ایک انسان آپ کے پاس آئے تاکہ آپ کی بات کو اور جو کچھ آپ پر نازل ہوا ہے، اسے سنے تو وہ امن میں ہے حتیٰ کہ وہ آپ کے پاس آکر اللہ کے کلام کو سن لے، پھر اپنے امن کی اس جگہ واپس چلا جائے جہاں سے وہ آیا تھا"۔[14]

ریاستیں اپنے داخلی امن کی وجہ سے دیگر ممالک میں حیثیت کی حامل ہوتی ہیں، گذشتہ چند سالوں سے جس طرح پاکستان داخلی امن واستحکام کے حوالے سے انتشار کا شکار ہوا، اس سے نہ صرف پاکستان کا دیگر ممالک میں تاثر خراب ہوا، بلکہ داخلی سالمیت کو بھی شدید بحران کا سامنا کرنا پڑا، حالانکہ کسی ریاست کا استحکام اس کے داخلی امن سے اس قدر جڑا ہوا ہے کہ اگر نقص امن کے واقعات ہوں تو استحکام پر براہِ راست زد آتی ہے۔ داخلی امن واستحکام کی ایک جھلک سورۃ یوسف سے ہمیں یوں ملتی ہے:

﴿فَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰٓى اِلَيۡهِ اَبَوَيۡهِ وَ قَالَ ادۡخُلُوۡا مِصۡرَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ﴾[15]

"پھر جب وہ یوسف کے یہاں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے والدین کو اپنے پاس ٹھکانہ دیا، اور فرمایا کہ تم سب مصر میں داخل ہو جاؤ، اور اللہ نے چاہا تو امن سے رہو"۔

اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو مصر کی بادشاہی عطا کی، قحط سالی کا دور ختم ہو گیا، والدین سے ملاقات کرنا اور اپنے بھائیوں سے ملنا بھی ان کے لیے ایک نعمت تھی، لیکن ان تمام نعمتوں کے باوجود جس نعمت کا انہوں نے اپنے والدین کے سامنے اظہار کیا، اس کا تعلق امن وامان سے ہے، اسی لیے فرمایا اللہ نے چاہا تو مصر میں امن وامان سے رہو، گویا امن واستحکام اس قدر بڑی نعمت اور ضروری چیز ہے، کہ دیگر نعمتیں اس کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں، چنانچہ امن کا بطور خاص تذکرہ اس بات پر دال ہے کہ اقوام اپنی ریاستوں میں امن کے ساتھ ہی دینی و دنیاوی فوز وفلاح کی حامل ہو سکتی ہیں۔

امن وامان کے ایجابی پہلو اُس وقت ریاست کا حصہ بنتے ہیں، جب ریاست اپنا نظامِ حکمرانی صحیح اور درست اصولوں پر استوار کرتی ہے، یعنی ریاست کی باشندگان کے قلب و ذہن میں درست اور مثبت سوچ متحرک کرنے کے لیے ریاست کو اپنا کارِ حکمرانی انبیاء علیہم اسلام کے مشن کے تناظر میں دیکھنا ہو گا، یہی ایک صورت ہے جس سے لوگوں کو فطرت کے قریب تر اور لایعنی تفکرات سے دور رکھا جا سکتا ہے۔

امن داخلی استحکام کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، اس کی مکمل تصویر مدینہ کی چھوٹی سی اور وسائل کی کمی کا سامنا کرنی والی وہ ریاست ہے، جس کی بنیاد نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد رکھی۔ یہاں پہنچ کر جب جنگی، دفاعی، معاشی اور معاشرتی دستور سازی کی گئی، وہ اپنی مثال آپ ہیں، دفاعی دستور میں جو صراحتیں موجود تھیں، ان پر ڈاکٹر حمید اللہ درج ذیل کلمات کے ذریعے اظہار کرتے ہیں:

"دفاع کے سلسلے میں اس دستور میں جو صراحتیں ہیں، ان میں سب سے پہلے یہ بات قابل ذکر ہے کہ امن اور جنگ ناقابل تقسیم چیز ہو گی، یعنی اگر امن ہو تو اس سلطنت کے سارے باشندوں کے لیے ہو گا اور جنگ ہو تو سارے باشندوں کے لیے، صلح وجنگ کی مرکزیت اور ناقابل تقسیم ہونا ایک اہم بات تھی، پھر اس میں یہ بھی صراحت ہے کہ اگر جنگ کے لیے باہر جانے کی ضرورت پیش آئے تو اس کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں ہو گا کہ کون فوج میں شریک رہے اور کون فریق فوج میں نہ رہے۔ گویا آپ ﷺ کو کمانڈر انچیف سے بھی زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ آپ ﷺ کو اختیار تھا کہ اپنی فوج سے ان تمام لوگوں کو خارج کر دیں جو مشتبہ ہوں اور جو فوج کے

اندر رہ کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہیں، گویا آپ نہ صرف جنگی انتظامات کے مالک تھے بلکہ جنگ کے سیاسی پہلوؤں پر بھی آپ ﷺ ہی کا دخل تسلیم کیا گیا"۔ 16

مملکت و ریاست کا مضبوط نظم و نسق اور وحدت ہی وہ بنیاد ہے، جس سے کوئی بھی ریاست اپنے داخلی معاملات کو مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ خارجہ امور پر بھی سنجیدہ اور متاثر کن اقدامات کر سکتی ہے، لیکن مستحکم ایجابی پہلوؤں کی بنیاد ریاست اس وقت رکھ سکے گی جب اس ریاست کے باشندگان کو ایک اکائی میں پرونے کے لیے وہ تمام اقدامات کیے جائیں، جن کے ذریعے لوگوں کی معاشی، معاشرتی، فکری اور نظریاتی سوچ کی ترجمانی ممکن ہو سکے، جس سے ظلم و ناانصافی کا استحصال ہو اور امن و امان کو فروغ ملے۔

فساد فی الارض کا انسداد اور سلبی پہلو:

امن و امان کے مقابلے میں فتنہ و فساد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اہل لغت نے فساد سے مراد خلل کے بھی لیے ہیں، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی فساد کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"فساد لغت میں کسی شے میں خلل واقع ہونے کا نام ہے۔ اصطلاح میں ایسے فعل کو کہا جاتا ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے درست ہو اور وصف کے اعتبار سے نادرست، ''ماکان مشروعاً باصلہ غیر مشروع بوصفہ''، اسی طرح ''والفساد والبطلان فی العبادات سوائً''عبادات میں بالاتفاق فاسد اور باطل ایک ہی ہے، فقہاء کے نزدیک معاملات میں بھی باطل و فاسد کا کوئی فرق نہیں"۔ 17

مولانا مودودی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"ایک اسلامی ریاست میں انتظامیہ (Executive) کا اصل کام احکام الٰہی کو نافذ کرنا اور ان کے نفاذ کے لیے ملک اور معاشرے میں مناسب حالات پیدا کرنا ہے۔ یہی امتیازی خصوصیت اس کو ایک غیر مسلم ریاست کی انتظامیہ سے ممیز کرتی ہے، ورنہ ایک کافر حکومت اور مسلم حکومت میں کوئی فرق باقی ہی نہیں رہتا۔ انتظامیہ وہی چیز ہے جس کے لیے قرآن میں ''اولی الامر'' اور حدیث میں ''امراء'' کے لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن و حدیث دونوں میں ان کے سمع و طاعت (Obedience) کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ احکام خدا اور رسول کے تابع رہیں"۔ 18

درج بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ریاست کے قیام کے بعد، خصوصاً 'اولی الامر' اور 'امراء' کے فرائض منصبی میں خلل ڈالنا، ان سے مخاصمت اور ٹکراؤ دراصل فتنہ و انتشار کا باعث بنتا ہے، جس کی

بھرپور انداز میں مذمت کی گئی ہے، نیز مقننہ کو ایسے قوانین کی عملداری کا حکم دیا گیا ہے جو شریعت نے مختص کیے ہیں، جن قوانین کے ذریعے فساد فی الارض اور انتشار کو روکنے میں ہر ممکن اقدامات کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ذیل میں از روئے قرآن فساد فی الارض، فتنہ ارتداد و تکفیر، حرابہ، فتنہ و فساد، فرقہ واریت، انتہا پسندی کا جائزہ لیا جائے گا جس کے ذریعے زمین کو فساد و فتنہ سے پاک کیا جا سکتا ہے۔

فساد فی الارض کا انسداد:

فساد فی الارض انسانیت کے لیے وہ زہر قاتل اور بد نصیبی کا پیش خیمہ بنتی ہے کہ اس سے اقوام و ملل کا عروج تاریکی میں چلا جاتا ہے اور قومیں قصہ پارینہ بن جاتی ہے، کیونکہ اس سے ایسی قباحتیں جنم لیتی ہیں جو نسل انسانی کا سکھ اور سکون اس قدر برباد کر دیتی ہیں کہ ان کے لیے راحت اور آسودگی کے ساتھ رہنا محال ہو جاتا ہے۔قرآن مجید میں جابجا مقامات پر فساد کی نشاندہی مذموم انداز میں بیان کی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلاَ تُفسِدُوا فِی الاَرضِ بَعدَ اِصلاَحِهَا﴾ [19]

"اور دنیا میں اس کے بعد کہ اس کی درستی کر دی گئی ہے، فساد مت پھیلاؤ"۔

اللہ تعالیٰ نے زمین میں فساد برپا کرنے اور اصلاح کے بعد خرابی سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اگر معاملات صحیح اور درست سمت میں چل رہے ہوں، اس کے بعد ان میں خرابی پیدا کی جائے، یہ صورت انسانیت کا سکھ تباہ کر دیتی ہے، لہٰذا مضمون کی اہمیت کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے اسی تاکید کو سورہ اعراف کی آیت نمبر ۵۸ میں دوبارہ دہرایا گیا، تاکہ اچھی طرح معاملہ واضح ہو جائے۔

اسی طرح دنیا کو غیر متوازن کرنے کا سبب کسی چیز کو قرار دیا گیا ہے تو وہ بھی فساد ہی ہے، سورہ روم میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿ظَهَرَ الفَسَادُ فِی البَرِّ وَالبَحرِ بِمَا كَسَبَت اَيدِی النَّاسِ﴾ [20]

"خشکی اور تری میں لوگوں کی بداعمالیوں کے باعث فساد پھیل گیا"۔

فساد کے نقصانات:

فساد کا انجام قتل، خونریزی، اور معاشرتی افراتفری پر منتج ہوتا ہے، لہٰذا فسادی لوگ نہ صرف اللہ کے مجرم ہیں بلکہ تمام انسانیت کو ہلاک کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مِن اَجلِ ذٰلِكَ كَتَبنَا عَلٰی بَنِیٓ اِسرَآئِيلَ اَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفسًا بِغَيرِ نَفسٍ اَو فَسَادٍ فِی الاَرضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾ [21]

"اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ بات لکھ دی کہ جو شخص کسی انسان کو "بلا عوض کسی جان کے یا زمین میں فساد کے بغیر" قتل کر دے تو گویا اُس نے سارے انسانوں کو قتل کر دیا"۔

گویا فساد سے اشرار کا ایسا سلسلہ جنم لیتا ہے جو انسانی زندگیوں کو نگل جاتا ہے، حافظ ابن کثیر درج بالا آیت سے متعلق سعید بن جبیر کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جس نے کسی ایک مسلمان کے خون کو حلال سمجھا اس نے گویا تمام انسانوں کے خون کو حلال سمجھا اور جس نے کسی ایک مسلمان کے خون کو حرام سمجھا تو اس نے گویا تمام انسانوں کے خون کو حرام سمجھا۔ اسی طرح ابن جریج نے اعرج سے اور انہوں نے امام مجاہد سے روایت کیا ہے کہ جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم رسید کرے گا، اسے غضب اور لعنت میں مبتلا کرے گا، اور اس کے لیے عذاب عظیم تیار کرے گا، اگر وہ سب لوگوں کو بھی قتل کرے تو اس سے سے زیادہ اسے عذاب نہ ہو"۔[22]

سورہ بقرہ میں نقض امن برپا کرنے والے، اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو توڑنے والے، اور رشتوں ناطوں کو توڑنے والے گھاٹے والے قرار دیئے گئے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيُفسِدُونَ فِي الاَرضِ اُولَٰٓئِكَ هُمُ الخٰسِرُونَ﴾[23]

"اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، یہی لوگ نقصان اُٹھانے والے ہیں"۔

اسی طرح فسادیوں کو کفر اختیار کرنے والے اور اللہ کی راہ سے روکنے والے شمار کیا گیا ہے، سورہ النحل میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللهِ زِدنٰهُم عَذَابًا فَوقَ العَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفسِدُونَ﴾[24]

"جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، ہم اُن کے عذاب پر مزید عذاب بڑھا دیں گے، اِس وجہ سے کہ وہ فساد پھیلاتے تھے"۔

گویا شرارتی اور فسادی لوگوں اس قدر دردناک انجام سے دوچار کیے جانے والے ہیں۔

اسی طرح قرآن مجید نے قومِ ثمود کے ظالم اور شر انگیزی کو ہوا دینے والے نو(۹) سرداروں کا تذکرہ یوں کیا ہے:

﴿وَكَانَ فِي المَدِينَةِ تِسعَةُ رَهطٍ يُفسِدُونَ فِي الاَرضِ وَلَا يُصلِحُونَ﴾[25]

اور شہر میں نو افراد کی ایک جماعت تھی یہ لوگ زمین میں فساد پھیلاتے تھے اور اصلاح نہ کرتے تھے۔

آیت میں فسادی لوگوں کا عدد بیان کرنا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ فساد مچانے والے کسی بھی انداز سے اپنی سر گرمی انجام دیں اور ان کی تعداد کتنی ہی ہو، اللہ کے شمار اور حصار میں ان کا معاملہ مکمل طور موجود ہے۔اسی لیے فسادی لوگوں کا عدد بھی ۹ بیان کیا گیا ہے۔

امام عبدالرزاقؒ نے کہا ہے کہ ہمیں یحییٰ بن ربیعہ صنعانی نے یہ خبر دی ہے کہ میں نے عطاء بن ابورباح کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا: ﴿وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ .... ﴾((كَانُوا يُقرِضُونَ الدِّرهَمَ)) "[26] وہ درہموں کو کاٹ لیتے تھے"

یعنی درہم ودینار اور سونے چاندی میں کو کاٹ لینے کو بھی "فساد فی الارض" شمار کیا گیا ہے، چونکہ اس سے قانون مساوات پر زد پڑتی ہے اور لوگوں کو معاشی استحصال کر کے انہیں نقصان سے دوچار کیا جاتا ہے، لہٰذا اس عمل کو بھی 'فساد فی الارض' کہا گیا ہے۔

امام مالکؒ نے اس یحییٰ بن سعیدؒ سے اور انہوں نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے:

"قَطعُ الذَّهَبِ، وَالوَرِقِ مِنَ الفَسَادِ فِي الأَرضِ" [27]

"سونے اور چاندی (درہم ودینار) کو کاٹ لینا بھی فساد فی الارض ہے"۔

لہٰذا شریعت اسلام میں فساد فی الارض کے وہ تمام طریقے جن سے اضطراری کیفیت جنم لے، انہیں واضح طور پر بیان کر دیا ہے، تاکہ اہل علم اور اہل اقتدار اُن کا انسداد کر سکیں۔

ان سزاؤں کی عملداری کی صورت میں کسی بھی اسلامی ریاست کے لیے امن و امان کی فضا قائم کرنا انتہائی آسان ہو جائے گا، بصورتِ دیگر مجرموں کی پشت پناہی سے جرائم کا انسداد کرنا ناممکن ہے، کیونکہ قرآن مجید نے اس فتنے کو قتل سے بھی بڑا جرم قرار دیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالفِتنَةُ أَشَدُّ مِنَ القَتلِ﴾ [28] "اور فتنہ انگیزی تو قتل سے بھی زیادہ سخت (جرم) ہے"۔ اور مزید فرمایا: ﴿وَالفِتنَةُ أَكبَرُ مِنَ القَتلِ﴾ [29] "اور فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے"۔

ایسے واضح احکامات کی موجودگی میں ریاست کی ذمہ داریوں میں یہ شامل ہے کہ وہ فتنہ کے ارتداد کے لیے اپنا تمام سر اثر ورسوخ اور اختیارات کا استعمال کرے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ریاست کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ مفاسد کے محرکات کو جاننے کے لیے تمام اسباب بروئے کار لائے، تاکہ لوگوں کو ایسی روش اختیار کرنے سے پہلے ہی روکا جا سکے۔

استحکام مملکت کے لیے حکومتی ذمہ داریوں سے متعلق ڈاکٹر محمود اختر لکھتے ہیں:

"ملک میں بدامنی اور بے چینی کے اسباب میں ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ حکمران عوام کے حقوق کی ادائیگی سے بے اعتنائی سے کام لینے لگتے ہیں۔ایسی صورت میں عوام حکمرانوں سے مایوس ہو جاتے ہیں۔عوام اور حکمرانوں کے درمیان فاصلے پیدا ہونے لگتے ہیں۔اگر یہ فاصلے زیادہ دیر تک موجود رہیں تو نفرت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔یہ نفرت بڑھ کر مظاہروں اور حکومت کے خلاف احتجاج کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔عوام، حکمرانوں کو اپنے سے الگ تصور کرنے لگتے ہیں اور وہ اس بات کے منتظر رہنے لگتے ہیں کہ کب ان حکمرانوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوتا ہے۔اس صورت حال میں عوام بددل بھی ہو جاتے ہیں اور ریاستی معاملات سے وہ بالکل لاتعلق ہو جاتے ہیں"۔[30]

اسلامی نظریاتی کونسل کی سرپرستی میں ایک مذاکرہ بنام ''اسلام اور دہشت گردی: اسباب، تجاویز، سفارشات'' منعقد ہوا، جس میں تخریب کاری، فتنہ انگیزی اور فساد فی الارض سے جڑی ہوئی چیزوں کو زیر غور لایا گیا، اس مذاکرہ کے اختتام پر جو تجاویز وسفارشات مرتب کی گئیں، یقیناان پر عمل پیرا ہونے سے داخلی امن واستحکام کو کافی حد تک قائم کیا جا سکتا ہے۔تجاویز وسفارشات حسب ذیل ہیں:

۱۔ دہشت گردی کے واقعات کا حقیقی سرا ملک سے باہر ہے، عالمی منظر نامے میں اس کا سراغ لگانے، اور ان کی منصوبہ بندی کرنے والے ذہن پر نظر رکھنا ازبس ضروری ہے۔

۲۔ تمام مسلم ممالک کو دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے مل جل کر متفقہ لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

۳۔ مذہبی گروہوں کی قیادت کو بقائے باہمی اور رواداری کے اصولوں پر پختہ معاہدے کا پابند کیا جائے اور بیرونی مداخلت کے دروازے بند کیے جائیں۔

۵۔ ہر قسم کے جلسے جلوسوں کو اپنی اپنی آبادیوں میں محدود کر دیا جائے۔

۶۔ غیر مسلکی مساجد اور مدارس کو رواج دیا جائے۔

۷۔ سیاسی نظام مستحکم کیا جائے، ہر علاقے میں برابر ترقیاتی کام ہوں، مستحق لوگوں کو ان کے جائز حقوق دیئے جائیں۔

۸۔ مذہبی اور نسلی تفریق کو ختم کر کے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ختم کی جائیں۔

۹۔ قومی میڈیا کو نظم وضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے واقعات اور شخصیات کے بارے میں سنسنی خیزی پھیلانے کی بجائے عوام کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

۱۰۔ ملکی سرحدیں متعین اور مکمل طور پر بند ہونی چاہئیں اور قبائلی علاقوں کو مکمل طور پر ریاست کی حدود کے اندر شامل کرنا چاہیے۔

۱۱۔ علماء کرام کو آگے بڑھ کر ملک میں اتفاق و اتحاد اور افہام و تفہیم کی فضا پیدا کرنے میں خصوصی کردار ادا کرتے ہوئے مساجد میں فرقہ واریت اور مذہبی منافرت کے خلاف تعلیم دی جائے۔

۱۲۔اختلاف کو برداشت کرنے کی ثقافت کو فروغ دیا جائے، اختلاف کو منافرت، تشدد اور دہشت گردی کا جواز نہ بننے دیا جائے"۔[31]

خلاصہ کلام:

اختیارات کی دستیابی کے ساتھ ذمہ داری کا دائرہ کار بھی وسیع ہو جاتا ہے، فرد، معاشرہ اور ریاست ہر سطح پر حقوق و فرائض کا ادراک کرنے کی ضرورت ہے، اس ضمن میں ریاست نہ صرف اپنا کلیدی کردار ادا کرے گی بلکہ شعوری بیداری کے لیے وہ تمام اقدامات کرے گی جس کی رعایا کو ضرورت ہو۔ بڑھتے ہوئے جرائم کو مد نظر رکھتے ہوئے قانون سازی اور تعزیرات کا اطلاق ایسے فیصلے ہیں جن سے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے، بلکہ جرائم کے محرکات کو جاننے کے بعد ان کے تدارک کے لیے مخلصانہ کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔

ریاست کو حکومت کاری کے معاملات چلانے کیلئے، امن وعامہ کی فضا کو قائم کرنے کے لیے، فتنہ و فساد کے خاتمے کے لیے، ہر فرد تک انصاف کی جلد اور مکمل فراہمی کے لیے، وسائل کی منصفانہ تقسیم کے لیے، ظلم و جبر، ناجائز بالادستی کو ختم کرنے کے لیے اور عوام کی نیک خواہشیں اور جذبات سمیٹنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان میں سر فہرست لوگوں کو فکری، مذہبی اور سیاسی آزادی فراہم کرنے کے علاوہ انہیں محفوظ اور پر امن بنانے کے لیے کردار ادا کرنا ہے۔

رعایا کے جان و مال کے تحفظ کا یہی وہ جذبہ تھا جو ریاست مدینہ کی تشکیل کے بعد سامنے آیا، جب لوگوں کی عزت و آبرو کا دفاع کیا گیا اور مواخات کا سلسلہ قائم کیا گیا، اس کے نتیجے میں ریاست کا دفاع کرنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھ کر خندقیں کھودنے اور ہر طرح کی قربانی دینے کا جذبہ سامنے آیا۔ آج بھی اگر ایسی نظیر قائم کی جائے اور لوگوں کو ان کے جائز حقوق دیئے جائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ریاست داخلی اور خارجی طور پر مستحکم نہ بنے۔

حوالہ جات وحواشی

1 آل عمران ۳ : ۹۶

2 آل عمران ۳ : ۹۷

3 الشیبانی، احمد بن حنبل ، ابو عبداللہ، "مسند الامام احمد بن حنبل" ، مؤسسته الرسالة، بیروت، لبنان، الجزء : ۳۵ ، ص ، ۲۶۱، الرقم : ۲۱۳۳۳

4 القصص، ۲۸ : ۵۷

5 العنکبوت، ۲۹ : ۶۷

6 البقرة، ۲ : ۱۲۵

7 البقرة، ۲: ۱۲۶

8 الجصاص الحنفی، احمد بن علی الرازی، علامه ابوبکر ، ''احکام القرآن''، مترجم: مولانا عبدالقیوم، بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ج:۱، ص:۱۶۸

9 القرآن، ۲ : ۲۳۸

10 ہیکل، محمد حسین، ''حیات محمد ﷺ''، مترجم: محمد مسعود عبدہ، الفیصل تاجران کتب۔لاہور، ص:۲۲۷

11 النساء، ۴: ۹۱

12 حافظ ابن کثیر، عماد الدین، ابوالفداء، تفسیر ابن کثیر، مترجم: مولانا محمد خالد سیف، دارالسلام۔لاہور، ج:۲، ص:۱۵۵

13 الانعام، ۶: ۸۱

14 حافظ ابن کثیر، ''تفسیر ابن کثیر''، مترجم: مولانا محمد خالد سیف، ج:۳، ص:۵۳

15 یوسف، ۱۲: ۹۹

16 حمیداللہ، ڈاکٹر محمد، ''اسلامی ریاست''، الفیصل تاجران کتب، ص:۲۲

17 رحمانی، سیف اللہ، مولانا، ''قاموس الفقہ''، زمزم پبلشرز۔کراچی، ج:۴، ص:۴۵۳

18 مودودی، ابوالاعلیٰ، سیّد، ''اسلامی ریاست''، ص:۳۴۷

19 الاعراف، ۷: ۵۶

20 الروم، ۳۰: ۴۱

21 المائدہ، ۵: ۳۲

22 حافظ ابن کثیر، ''تفسیر ابن کثیر''، مترجم: مولانا محمد خالد سیف، ج:۲، ص:۳۲۷

23 البقرة، ۲: ۲۷

24 النحل، ۱۶: ۸۸

25 النمل، ۲۷: ۴۸

26 الصنعانی، عبدالرزاق بن ہمام، ''تفسیر عبدالرزاق''، دارالکتب العلمیه، بیروت۔لبنان، ج:۲، ص: ۴۷۹، رقم: ۲۱۷۱

[27] المدنی، مالک بن انس بن مالک بن عامر، ''الموطا''، موسسة زاید بن سلطان، ابوطب۔الامارات، کتاب البیوع، باب بیع الذھب بالورق، ج:۴، ص: ۹۱۸، رقم: ۲۳۴۱

[28] البقرة، ۲: ۱۹۱

[29] البقرة، ۲: ۲۱۷

[30] محمود اختر، ڈاکٹر حافظ، ''استحکامِ مملکت اور بدامنی کا انسداد''، ص: ۷۷

[31] محمد خالد سیف، اسلام اور دہشت گردی: اسباب، تجاویز، سفارشات، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد، ص: ۱۴، ۱۵